© rasailojaraid.com

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

پہلی قسط

عجمی تصورات کا دوسرا دور

بیرونی فلسفوں اور غیر اسلامی نظریات کا دوسرا دور تیرھویں صدی ہجری یا انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ لیکن دوسری صدی ہجری کی بہ نسبت اب حالات بہت مختلف تھے۔ اس وقت مسلمان فاتح تھے اور انہیں سیاسی غلبہ حاصل تھا۔ اور جن فلسفوں سے انہیں سابقہ پیش آیا تھا وہ مفتوح و مغلوب قوموں کا فلسفہ تھا۔ اس وجہ سے ان فلسفوں کا حملہ بہت ہلکا ثابت ہوا۔ اس کے برعکس تیرھویں صدی ہجری میں یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا جبکہ مسلمان ہر میدان میں پٹ چکا تھا۔ اس کے ملک پر دشمنوں کا غلبہ ہو چکا تھا۔ معاشی حیثیت سے انہیں کچل ڈالا گیا تھا۔ ان کا نظامِ تعلیم درہم برہم ہو چکا تھا اور ان پر فاتح قوم نے اپنی تعلیم، اپنی تہذیب، اپنی زبان اپنے قوانین اور اپنے اجتماعی، سیاسی اور معاشی اداروں کو پوری طرح مسلط کر رکھا تھا۔ ایسے حالات میں فاتحوں کے فلسفے اور سائنس نے ان کو معتزلہ کی نسبت ہزاروں درجہ زیادہ مرعوب کر دیا۔ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب سے جو افکار و نظریات درآمد ہو رہے ہیں وہ سراسر معقول ہیں ان پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقید کر کے حق و باطل کا فیصلہ کرنا محض ایک خیال ہے اور زمانہ کے ساتھ چلنے کی صورت بس یہی ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال لیا جائے۔

اس شکست خوردہ ذہنیت نے وہی معتزلہ والی سہ گونہ ٹیکنیک استعمال کی:

۱۔ احادیث کو جہاں تک ہو سکے مشکوک اور ظنی قرار دیا جائے اور مفسرین پر الزام لگایا جائے کہ وہ اسرائیلی روایات سے استفادہ کرتے ہیں۔

۲۔ سنت کے بجائے خود حجت یا سند ہونے سے انکار کر دیا جائے اور اس کے بعد

۳۔ قرآن کی من مانی تاویلات کے لئے راستہ صاف کر لیا جائے۔

لیکن آج اس ٹیکنیک کو استعمال کرنے کی صورت وہ نہیں جو معتزلہ کے دور میں تھی۔ معتزلین خود ذی علم لوگ تھے۔ عربی زبان میں اور ادب میں بڑا پایہ رکھتے تھے۔ اور ان کو سابقہ بھی ایسے لوگوں سے تھا جن کی علمی زبان عربی تھی، عام لوگوں کا تعلیمی معیار بلند تھا۔ علمائے دین ہر طرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بکثرت موجود تھے۔ لہٰذا معتزلین بہت سنبھل کر بات کرتے تھے۔ مگر آج کا دور ایسا ہے کہ معتزلین کا علمِ دین کا سرمایہ بیشتر مستشرقینِ مغرب کا مرہونِ منت ہے اور عوام کی علمی سطح انتہائی پست ہے۔ لہٰذا آج کا حملہ بھی معتزلین کے حملہ سے دوگونہ وجوہ کی بنا پر شدید تر ہے۔

سر سیّد احمد خان مرحوم

اس دور کے سرخیل سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء) ہیں آپ نے مغرب میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔ مغربی افکار و نظریات سے شدید متاثر تھے اور مسلمانوں کی بھلائی اس بات میں سمجھتے تھے کہ وہ مغربی علوم سے آراستہ ہوں اور اس تہذیب کو جوں کا توں اپنا لیں۔ اس غرض کے لئے آپ نے دوگونہ اقدامات کئے۔ ایک تو ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ مسلم کالج کی داغ بیل ڈالی۔ دوسرے اسی دَور میں قرآنِ کریم کی تفسیر لکھ کر اپنے نظریات کو کھل کر قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس دوگونہ اقدام سے آپ نے مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہن میں مغربی افکار و نظریات بھرنے اور پھر ملّتِ اسلامیہ کا حلیہ بگاڑنے کی جو خدمات سرانجام دیں اس پر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

؎ آنچ گُم، ہر طرف دھوُاں ہی دھوُاں
وائے بر سعی سیّد احمد خان

یہ وہ دور تھا جب یورپ صرف اس بات کو ماننے پر تیار تھا جو عقل و تجربہ کی کسوٹی پر پرکھی جا سکتی ہو۔ بالفاظ دیگر کوئی ایسی بات جو مافوق الفطرت (SUPPER NATURAL) یا خارقِ عادت ہو، اہل مغرب کے ہاں ناممکن الوقوع اور خلافِ عقل سمجھ کر ردّ کر دی جاتی تھی۔

دوسرے سر چارلس ڈاروِن (۱۸۰۹ء - ۱۸۸۲ء) کا نظریۂ ارتقاء بھی منظرِ عام آ چکا تھا۔ یہ سوال ڈاروِن سے پہلے بھی "HIT" ہو چکا تھا کہ آیا انسان اولادِ ارتقاء ہے یا اس کی پیدائش کسی دوسری نوعیت سے ہوئی تھی۔ ڈاروِن نے ۱۸۵۹ء میں ایک کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPICIES) لکھ کر یہ نظریہ مدوّن طور پر پیش کیا تھا کہ انسان اولادِ ارتقاء ہے۔

تیسرے یہ دور خالص مادیت پرستی کا دَور تھا۔ ہر کام کے زیبا و نازیبا ہونے کا معیار دنیوی نفع و نقصان بن گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس تہذیبِ نو نے مرد و زن کی مساوات کا نعرہ لگا کر کئی قسم کے عائلی مسائل کھڑے کر دیئے تھے جو اسلامی تعلیمات سے براہِ راست ٹکراتے تھے۔

© rasailojaraid.com

سر سیّد ان تمام افکار و نظریات سے شدید متاثر تھے۔ لہٰذا آپ نے:

© rasailojaraid.com

(۱) انبیاء کے معجزات سے یا تو سرے سے انکار ہی کر دیا۔ یا ایسی تاویل پیش کی کہ وہ معجزہ ہی نہ رہے۔ خواہ یہ تاویل بجائے خود خواہ کتنی ہی غلط اور مضحکہ خیز ہو۔

(۲) معجزات کے علاوہ باقی خوارقِ عادت باتیں جو قرآن میں مذکور ہیں، ان کی بھی ایسی ہی تاویلات پیش کیں۔ مثلاً جنت اور دوزخ کی بعض کیفیات۔

(۳) ڈارونی نظریہ ارتقاء سے متاثر ہو کر حضرت آدمؑ کے فردِ واحد یا نبی ہونے سے انکار کر دیا۔ نیز فرشتوں اور ابلیس کے خارجی تشخص سے بھی، جس میں ایمان بالغیب کے بہت سے اجزاء پر زد پڑتی تھی۔

(۴) مسائلِ حاضرہ پر قلم اٹھا کر موجودہ تہذیب سے ہم رنگی میں اسلامی تعلیمات کا حلیہ بگاڑ دیا۔

ہم یہاں انہی باتوں کو زیرِ بحث لائیں گے۔ آپ نے چند رسائل اور بالخصوص تفسیر القرآن لکھ کر یہ نظریات امت کے سامنے پیش کئے۔ اس "ماڈرن اسلام" کی غرض و غایت کا اندازہ آپ کی ایک تقریر کے درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

جدید علم کلام کی ضرورت اور خصوصیات

"اس زمانہ میں ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے جس سے یا تو ہم علومِ جدیدہ کو باطل ثابت کر دیں یا پھر انہیں اسلام کے مطابق کر دکھائیں ...... میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش، حال کے علمِ طبعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا ان کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے۔ وہ سب گنہگار اور یقیناً گنہ گار ہوں گے"۔ (پاکستان کا معمارِ اول سرسید ص۵۵، مطبوعہ طلوعِ اسلام، لاہور)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ سید صاحب کے خیال میں:

۱۔ موجودہ علومِ طبیعی اور فلسفہ کا یا تو بطلان ثابت کرنا یا پھر انہیں اسلام کے مطابق کر دکھانا ایک بہت بڑا دینی فریضہ ہے۔

۲۔ جو لوگ اہلیت ہونے کے باوجود ان دونوں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کرتے۔ وہ گناہ گار ہیں۔

اور سید صاحب نے اس گناہ سے بچنے اور دینی فریضہ کو انجام دینے کے لئے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ علم طبیعی یا فلسفہ کو تو باطل نہ ثابت نہ کر سکے۔ البتہ بزعم خود انہیں اسلام کے مطابق کر دکھایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن ہمیں افسوس ہے کہ علم طبعی و فلسفہ کو اسلام کے مطابق کرنے میں صرف کر دیں۔ اس اہم کام کے لئے جو طریق کار انھوں نے اختیار کیا وہ بھی درج ذیل اقتباس سے واضح ہے:

(حاشیہ: ص یا بعثت کی غرض کے بجائے اپنی تمام تر کوششیں اور ذہنی صلاحیتیں اسلام کو علم طبعی و فلسفہ کے مطابق ...)

حدیث اور فقہ سب ناقابلِ حجت ہیں

"اسلام کے متعارف مجموعہ میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان "ملہم من اللہ" سمجھتے ہیں۔ اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزماںؐ کے دل میں القا ہوا ہے۔ اسی طرح نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے، صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ جس میں جو بات مسائلِ فلسفہ اور حکمت کے خلاف ہو۔ اس میں اور مسائلِ حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائلِ حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے۔ پس انھوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے "حسبنا کتاب اللہ" کہہ کر اپنے جدید علم کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق صرف قرآنِ مجید کو قرار دیا۔ اور اس کے سوا تمام مجموعہ احادیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے، اور تمام علماء اور مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جوابدہ خود علماء و مفسرین اور فقہاء و مجتہدین ہیں نہ کہ اسلام، اپنی بحث سے خارج کر دیا۔ اس اصول کو ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآنِ مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔"

(حیاتِ جاوید، بحوالہ پاکستان کا معمارِ اوّل ص۵۷)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مجوزہ "کارِ عظیم" کے راستے میں تمام مجموعہ احادیث، تمام علماء و مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات ہی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ لہذا آپ نے ان تمام چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی در خورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اور ان سب سے بے نیاز ہو کر قرآن کی تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ قرآن کے متعلق ان کا نظریہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

قرآن اور نیچر

"ضروری تھا کہ قرآنِ مجید کی ہدایتیں اس طرح بیان کی جائیں کہ اس سے ایک طرف ایک صحرائی اونٹ چرانے والا بدو اور ایک اعلیٰ درجہ کا حکیم سقراط

لہ حضرت عمرؓ کا یہ قول محض موقع کی مناسبت سے تھا۔ ورنہ اپنی زندگی میں ہر مقام پر سنت کے متلاشی رہے اور اتباعِ سنت کا جزوِ دین سمجھتے رہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برابر فائدہ اٹھائیں۔ قرآنِ مجید ہی ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے۔ اور جس سے مختلف درجوں بلکہ متضاد حیثیتوں کے لوگوں کی یکساں ہدایت ہوتی ہے۔ ایک جاہل بدّو، ایک مقدس مولوی اس کے معانی سے جیسے ہدایت پاتا ہے۔ ایسا ہی ایک فلاسفر انہی الفاظ کے مقصود سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے۔ اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفہ کے خلاف نہیں پاتا۔" (رجحاتِ جاوید بحوالہ پاکستان کا معمارِ اوّل ص ۵۸)

اس اصول سے کسی کو بھی اختلاف کی گنجائش نہیں لیکن ہدایت حاصل کرنے کے لئے قرآنِ کریم نے خود ہی ایک اور شرط بھی عائد کی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ:

"یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً وما یضلّ بہ الّا الفاسقین" (۲/۲۶)

"خدا اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے اور وہ گمراہ بھی کرتا ہے تو نافرمانوں کو ہی۔"

یعنی قرآن واقعی سب کے لئے ہدایت ہے مگر جو قلبِ سلیم کے ساتھ اس سے ہدایت حاصل کرنا چاہے، جس کا دل کجرو اور فاسق نہ ہو، جو قرآن کی روشنی کے تابع ہو کر چلنا چاہے۔ نہ کہ قرآن کو اپنے قلب و ذہن کے تابع کرنا چاہے۔ سارے بدّو یا مولوی یا ہر زمانہ کے سقراط اس سے ہدایت ہی نہیں پاتے، بیشتر گمراہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اور مشاہدہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اور اکثر گمراہ فرقوں اور مذاہبِ باطلہ کے رہنما ذہین و فطین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ اصول ہی سرے سے غلط ہے کہ قرآن ہر فلاسفر کے فلسفہ یا ہر نیچری کی نیچریت کے مطابق ہے۔

یہ تو مسلمہ امر ہے کہ نیچر یا عام قوانینِ فطرت کا احاطہ کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ تو جن چند قوانینِ فطرت پر انسان کو آگہی ہوتی ہے، انہی تک قرآن کو محصور کر کے قرآنی آیات کی ان کے مطابق تاویل کر دینا کونسی دینی خدمت ہے؟ فلسفہ کا معاملہ اس سے بھی نازک ہے۔ فلسفہ ایک استدلالی علم ہے مگر انسان کی زندگی فلسفہ یا استدلالی علم کی پابند نہیں۔ زندگی کی بہت سی باتیں وجدان سے بھی حاصل ہوتی ہیں۔ اور قرآن کتابِ زندگی ہے۔ محض فلسفہ کی کتاب نہیں۔ لہٰذا جو شخص فلسفہ یا نیچر یا کسی خاص دور کی علمی سطح سے مرعوب ہو کر قرآن سے اس کا بطلان[1] ثابت کرنے کی بجائے

---

[1] بلاشبہ اسلامی تاریخ میں ایسے بہت سے فلاسفر ہوئے ہیں کہ جنہوں نے قرآن کے ساتھ احادیث سے علماء و مفسرین کے اقوال و آراء سے اور فقہاء و مجتہدین کے قیاسات اور اجتہادات سے بھرپور استفادہ بھی کیا اور اپنے دور کے فلسفہ کا بطلان بھی کیا ہے جیسے امام احمد بن حنبلؒ امام غزالیؒ امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ وغیرہم۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کو ان چیزوں کے مطابق کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ اس کی ذہنی شکست خوردگی کی دلیل تو بن سکتی ہے، قرآن کی تفسیر نہیں کہلا سکتی۔ سید صاحب اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے قرآن کو نیچر اور فلسفہ کے ماتحت بنا دیا ہے۔

۱۔ معجزات سے انکار

معجزہ کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ کوئی ایسا خرقِ عادت یا عدم دستور اور مشاہدہ کے خلاف واقعہ جس کا صدور کسی نبی سے ہوا ہو۔ قرآن نے معجزہ کے لئے "آیت" یا "مبصرہ" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور ایسا کوئی نہ کوئی معجزہ انبیاءؑ کے ساتھ لازم و ملزوم سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس لئے انبیاءؑ کے مخاطبین بالعموم ان سے اپنی بات کی صداقت کے ثبوت میں معجزہ کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ ایسے خرقِ عادت واقعات کی کئی صورتیں ہیں مثلاً:

انسان کی عادت ہے کہ کوئی واقعہ عادت کے خلاف سنتا ہے تو بالعموم اس کا انکار کر دیتا ہے۔ اگر بچشم خود دیکھ لے تو حیران رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہی واقعہ دو تین بار پیش آ جائے تو "عادت" بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی حیرانگی اور استعجاب ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال تو انسان کی اپنی پیدائش ہے۔ جو ناپاک پانی کے قطرہ سے پیدا ہوتا ہے اور جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ لیکن چونکہ یہ عادت مستمرہ بن چکی ہے۔ لہٰذا اس پر کسی حیرت و استعجاب تو در کنار اس کا خیال تک بھی نہیں آتا۔

اس کی دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی واقعہ انسانی تاریخ کے کسی مخصوص دور میں معجزہ سمجھا جاتا ہے لیکن بعد کے ادوار میں وہ معجزہ نہیں رہتا۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا کیا گیا تھا کہ ہوا ان کے تابع تھی اور وہ ایک ماہ کا سفر ایک پہر میں طے کر لیتے تھے۔ لیکن آج ہوائی جہاز کی دریافت نے اس معجزہ کے اعجاز کو ختم کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر ارسطو یا فیثا غورث کے زمانہ میں کوئی شخص یہ اعجاز پیش کرتا کہ یونان میں بیٹھ کر پاکستان میں رہنے والے کسی شخص سے بات چیت کر رہا ہے تو اسے عوام تو در کنار، مفکر بھی پاگل ہی قرار دیتے۔ لیکن آج ٹیلیفون کی ایجاد نے اس کی اعجازی حیثیت کو ختم کر دیا ہے۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اشیائے کائنات کے خواص سے متعلق انسان کا علم یا لاعلمی ہی کسی ایک واقعہ کو کسی خاص دور میں معجزہ سمجھتی ہے لیکن وہی واقعہ اس سے اگلے دور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں عادت بن جاتا ہے۔ اب دیکھئے قرآنِ کریم میں ایسے بے شمار واقعات مذکور ہیں جو آج تک "معجزہ" ہی بنے ہوئے ہیں اور انسان کا علم اس گتھی کو سلجھا نہیں سکا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے معجزات کو من وعن قبول کر لینا چاہیئے یا ان کی تاویل پیش کر کے انسان کی علمی سطح تک لے آنا چاہیے؟ یہ سوال، درحقیقت یہ سوال ہے کہ آیا انسان اشیائے فطرت کے خواص اور قوانین کا پوری طرح احاطہ کر چکا ہے؟ اگر تو اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو ایسے معجزات کا من وعن تسلیم کرنا ہی راہِ صواب ہے۔ اس سوال کے جواب میں سید صاحب خود لکھتے ہیں کہ:

"تمام قوانینِ قدرت ہم کو معلوم نہیں ہیں، وہ نہایت قلیل ہیں اور ان کا علم بھی پورا نہیں بلکہ ناقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی عجیب امر واقع ہو اور اس کے وقوع کا کافی ثبوت بھی موجود ہو اور اس کا وقوع معلومہ قانونِ قدرت کے مطابق بھی نہ ہو سکتا ہو اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ بغیر دھوکہ و فریب کے فی الواقعہ ہوا ہے، تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فی الواقعہ بلاشبہ اس کے وقوع کے لئے کوئی قانونِ قدرت ہے مگر اس کا علم ہم کو نہیں [illegible]

۴ قدرت کے مطابق واقع ہوا ہے۔ تو وہ معجزہ نہیں کیونکہ ہر وہ شخص کو وہ قانون معلوم ہو گیا ہو گا، اس کو کر سکے گا" (تفسیر احمدی جلد ۳، صـ۳۴) ..... حکماء و فلاسفہ نے معجزات یا کرامات کا انکار خواہ کسی وجہ سے کیا ہو، ہمارا انکار صرف اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ مخالف عقل کے ہیں اور اس لئے انکار کرنا ضرور ہے۔ بلکہ ہمارا انکار

۔ اس بنا پر ہے کہ قرآنِ مجید سے معجزات و کرامات یعنی ظہور ایسا بطور خرق عادت یعنی خلافِ فطرت یا خلافِ جبلت کے امتناع پایا جاتا ہے۔ جس کو ہم مختصر الفاظ میں یوں تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی امر خلافِ قانونِ قدرت نہیں ہوتا" (ایضاً، ص ۳۷)

غور فرمایا آپ نے، سید صاحب کے معجزہ کے اقرار میں بھی کتنے انکار پوشیدہ ہیں، آپ معجزہ سے صرف اس لئے انکار کر رہے ہیں کہ قرآنِ کریم میں کسی خلافِ قانونِ قدرت واقعہ کا ذکر نہیں۔

یہاں دو سوال ذہن میں ابھرتے ہیں:

(۱) کیا قانونِ قدرت کے خلاف کسی امر کا وقوع ممکن ہے یا نہیں؟ اور

(۲) کیا قرآنِ کریم میں ایسے کسی واقعہ کا ذکر ہے بھی یا نہیں جو قانونِ قدرت کے خلاف ہو؟

اب ہم انہی سوالات پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

قوانینِ قدرت | قوانینِ قدرت کے غیر متبدل ہونے کے ثبوت میں جو آیت پیش کی جاتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ یہ ہے :

وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا (۳۵/۴۳)

"سو تم خدا کی عادت میں ہرگز تبدیلی نہیں پاؤ گے ۔ اور خدا کے طریقہ میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے"

اب سوال یہ ہے قوانینِ قدرت تو لاتعداد ہیں کچھ قوانین اجرامِ فلکی کی حرکت، ان کی کششِ ثقل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ دوسرے اشیاء کے خواص سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ مائعات جم کر سکڑ جاتی ہیں، ہوا گرم ہو کر اوپر کو اٹھتی ہے۔ زہر انسان کو ہلاک کر دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر کچھ قوانین ایسے ہیں جو اخلاقیات اور قوموں کے عروج و زوال سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر کچھ قوانین ایسے ہیں جو جاندار اشیاء کے طبعی تقاضوں اور حیات و ممات سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ قرآن کریم جن "اللہ کے طریقہ" یا جن قوانینِ قدرت کو غیر متبدل قرار دیتا ہے۔ وہ کس قسم سے تعلق رکھتے ہیں:

قرآن میں یہ الفاظ متعدد بار استعمال ہوئے ہیں۔ اور ان سب مقامات کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اللہ نے جس طریق کو غیر متبدل قرار دیا ہے، وہ انسان کی اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کے قانون کو غیر متبدل قرار دیتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم اپنی سرکشی کی بنا پر نبی کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیتی ہے یا نبی بحکمِ الٰہی وہاں سے نکل جاتا ہے یا کوئی قوم اخلاقی پستیوں میں گر جاتی ہے تو وہ عذاب میں ماخوذ اور زوال پذیر ہو جاتی ہے اور یہ اللہ کا قانون ایسا قانون ہے جس میں تغیر و تبدل ناممکن ہے۔ اب آیاتِ ذیل ملاحظہ فرمایئے:

(۱) "وَلَا یَحِیۡقُ الۡمَکۡرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَہۡلِہٖ ؕ فَہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ ۚ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا" (۳۵/۴۳)

"اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے ہی پر پڑتا ہے۔ یہ لوگ تو بس پہلے لوگوں کی روش کے ہی منتظر ہیں۔ سو تم خدا کی عادت میں ہرگز تبدل نہ پاؤ گے۔ اور خدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔"

(۲) "وَاِنۡ کَادُوۡا لَیَسۡتَفِزُّوۡنَکَ مِنَ الۡاَرۡضِ لِیُخۡرِجُوۡکَ مِنۡہَا وَاِذًا لَّا یَلۡبَثُوۡنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۔ سُنَّۃَ مَنۡ قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنۡ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا۔" (۱۷/۷۶-۷۷)

"اور قریب تھا کہ یہ لوگ تمھیں زمین (مکہ) سے پھسلا دیں تاکہ تمھیں وہاں سے جلاوطن کر دیں اور اس وقت تمھارے بعد یہ بھی نہ رہتے مگر تھوڑی مدت۔ جو پیغمبر ہم نے تجھ سے پہلے بھیجے تھے، ان کے بارے میں ہمارا طریقہ کار یہی رہا ہے اور تم ہمارے طریق میں تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔"

(۳) "مَلْعُونِينَ اينما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتيلاً۔ سنة الله فی الذين خلوا من قبل ولن تجد لسنةِ الله تبديلاً" (۳۳/۶۱-۶۲)

"وہ پھٹکارے ہوئے جہاں پائے گئے، پکڑے گئے اور جان سے مار ڈالے گئے۔ جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان کے بارے میں بھی ہماری یہی عادت رہی ہے اور تم خدا کی عادت میں تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔"

(۴) "ثم لا يجدون وَليًا ولا نصيراً۔ سنةَ الله التی قد خلت من قبل وَلَنْ تَجِدُ لَسنة الله تبديلا" (۴۸: ۲۳)

"پھر کسی کو دوست نہ پائیں اور نہ مددگار۔ یہی خدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خدا کی عادت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔"

مندرجہ بالا جملہ مقامات میں قوموں کی اخلاقیات اور ان کے زوال کے قانون کو بیان کیا گیا ہے اور یہی ایسا قانون ہے جس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوتی۔ رہے دوسرے قوانینِ فطرت یا قدرت، تو ہمارا مشاہدہ ہے کہ ان میں تبدیلی ممکن ہے مثلاً

۱۔ اجرامِ فلکی کی حرکت کے قوانین جو ہمیں لگے بندھے اصولوں کے مطابق نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں بنی نوع انسان کی عمر نہایت قلیل ہے ورنہ اس عظیم کائنات کا وجود میں آنا اور پھر کسی وقت فنا ہو جانا ان قوانین میں تغیر و تبدل کی واضح دلیل ہے۔

۲۔ زہر کی یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کے لئے ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن کبھی وہی زہر انسان کے لئے تریاق بھی بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ خواہ کچھ ہو۔ لیکن واقعہ سے انکار ممکن نہیں۔

۳۔ دوسری تمام مائعات کے برعکس پانی جم کر پھیل جاتا ہے۔ جبکہ دوسری مائعات جم کر سکڑتی ہیں۔ یہ ایسی استثنائی صورت ہے۔ جو انسان کے علم میں آ چکی ہے مگر عام قانونِ قدرت سے اس استثنا میں کسی کو مجالِ انکار نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ کسی مخصوص مقام پر بارش کے طبعی عوامل یہ ہیں۔ سمندر سے فاصلہ، موسم، ہواؤں کا رخ پہاڑوں کی بلندی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کسی مخصوص مقام کوئی بالاتر ہستی موجود ہے جو ان قوانینِ قدرت کے تغیر و تبدل پر پورا کنٹرول رکھتی ہے۔

یہ اور ایسے بے شمار واقعات اور مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قوانینِ قدرت میں مستثنیات موجود ہیں۔ اگر زہر کسی خاص انسان کے لیے تریاق بن سکتا ہے تو آگ بھی کسی خاص انسان کے لیے "ٹھنڈی اور سلامتی والی" ہوسکتی ہے۔

ہمارے خیال میں انکارِ معجزات کی وجہ یہ نہیں کہ قوانینِ فطرت میں استثناء ناممکن ہے۔ کیونکہ ایسے مستثنیات تو مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ انسان کا دوسر والا بچہ بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ ماں باپ دونوں اندھے ہوں تو ان کی اولاد بینا بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ بلکہ اس انکار کی تہہ میں وہی ارسطو کا خدا کے متعلق تجریدی تصور ہے۔ جس کے تحت خدا نے ایک دفعہ کائنات کو حرکت تو دے دی ہے اور اب وہ خاموش تماشائی بن گیا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس نے قوانینِ فطرت بنا دیئے ہیں اور اب خود بھی ان کا پابند بن گیا ہے۔ لیکن قرآن ایسے خدا کا تصور پیش کرتا ہے جو "حیّ و قیوم" قادرِ مطلق اور حکیم و خبیر ہے اور جیسے چاہتا ہے، جب چاہتا ہے کرسکتا ہے۔ وہ قوانینِ فطرت کا پابند نہیں، قوانینِ فطرت اس کے پابند ہیں۔ وہ ان قوانین میں ہر وقت اپنی حکمت و مصلحت کے پیشِ نظر تغیر و تبدل کرسکتا اور کرتا رہتا ہے۔

قرآن میں مذکور معجزات

خدا کو "قدرت و اختیار" کی کرسی سے ہٹا کر جب ان لوگوں نے ایسے بے شمار معجزات کا ذکر دیکھا تو انھوں نے ان معنوں میں معجزات کا یکسر انکار کردیا جو معنی قرآن کی عبارت و الفاظ سے واضح طور پر سامنے آتے ہیں بلکہ ان واقعات کا رخ اس طرح موڑا اور قرآنی الفاظ کی ایسی مضحکہ خیز تاویل پیش کی کہ ان تمام معجزات کو "مطابق خطرت" بنا کر چھوڑا۔ اور اس کارِ خیر میں اتنی کوشش فرمائی کہ اب انہیں قرآن کریم میں کوئی معجزہ نظر نہیں آتا۔

ہم یہاں ان حضرات کی تمام تر تاویلات کا ذکر نہیں کرتے۔ البتہ ازراہِ تفنن چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں؛

© rasailojaraid.com

آگ کا ٹھنڈا ہونا حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ان لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں سرے سے آگ میں

۵ بارش کے موسم میں کبھی خوردہ موسم خشک گزر جاتا ہے اور کبھی سیلاب تک آجاتے ہیں اور کبھی موسم کے مطابق بارش ہوتی ہے۔ یہ امر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ...

© rasailojaraid.com

ڈالا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ معاملہ **محض کفار کی کوششوں اور تدبیروں تک ہی محدود رہا** (تفسیر القرآن دیباچہ ص۱۷، تفسیر ثنائی ص۳۹۲) ان کی دلیل یہ ہے:

"قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاَرَادُوْا بِہٖ کَیْدًا فَجَعَلْنٰھُمُ الْاَخْسَرِیْنَ (۲۱/ ۶۹-۷۰)

ہم نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیمؑ کے حق میں ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔ اور لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے تدبیر کی، سو ہم نے انہیں ناکام بنا دیا۔"

اب ان کی تدبیر کیا تھی؟ وہ یہ تھی کہ ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا جائے اور وہ اللہ نے ناکام بنا دی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اتنی ہی بات تھی تو خدا کو آگ کو حکم دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے اتنا بھی علم نہ تھا کہ ہونا ہوانا تو کچھ نہیں پھر آگ کو حکم دینے کا کیا مطلب؟

اصحاب فیل

اصحاب فیل کا قصہ قرآن میں یوں مذکور ہے کہ ابرہہ کے ہاتھیوں کے لشکر پر اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے جھنڈ بھیجے جنہوں نے اس لشکر پر اتنی کنکریاں برسائیں کہ سارے لشکر اور ہاتھیوں کو چھلنی کر دیا۔ اور بھس کی طرح بنا دیا۔ اب ہمارے دوست اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور وہ مر گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس وبا کی مکہ والوں سے کیا دوستی تھی کہ اس نے انہیں تو کچھ نہ کہا اور ابرہہ کے لشکر کو ہاتھیوں سمیت ختم کر کے دم لیا۔ اور پھر یہ ہاتھیوں کی چیچک کا تصور بھی خوب ہے۔

عصائے موسیٰؑ اور ید بیضا

اب ملاحظہ فرمائیے ان تاویلات کی زد کہاں تک پہنچتی ہے؟ سید صاحب فرماتے ہیں:

"ان آیات پر (جو عصائے موسیٰؑ کے سانپ بننے اور ید بیضاء پر دلالت کرتی ہیں) غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کیفیت جو حضرت موسیٰؑ پر طاری ہوئی اس قوت نفس انسانی کا ظہور تھا جس کا اثر خود ان پر ہوا تھا۔ یہ کوئی معجزہ یا فوق الفطرت نہ تھا اور نہ اس پہاڑ کی تلی میں جہاں یہ امر واقع ہوا کسی معجزہ کے دکھانے کا موقعہ تھا اور نہ یہ تصور ہو سکتا ہے کہ وہ پہاڑ کی تلی میں کوئی مکتب تھا۔ جہاں پیغمبروں کو معجزے سکھائے جاتے ہوں اور معجزوں کی مشق کرائی جاتی ہو۔ حضرت موسیٰؑ میں ازروئے فطرت و جبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس قسم کے آثار ظاہر ہوتے ہوں انھوں نے اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے اپنی لاٹھی پھینک دی اور وہ ان کو سانپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دکھائی دیا۔ یہ خود ان کا تصرف اپنے خیال میں تھا۔ وہ لکڑی لکڑی ہی تھی۔ اس میں فی الواقعہ کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ خدا نے کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ "فَانقَلَبَتِ الْعَصَا ثُعْبَانًا" (یعنی وہ لاٹھی بدل کر سانپ ہو گئی) بلکہ سورہ نمل میں فرمایا: "کَاَنَّهَا جَآنٌّ یعنی وہ گویا اژدہا تھا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ درحقیقت اژدہا نہیں ہوئی تھی، بلکہ وہ لاٹھی کی لاٹھی تھی۔" (ج ۳، ص ۲۲۲)

سید صاحب کی اس تحقیق پر دو اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

(۱) ہمیں قوتِ باطنی بھی تسلیم ہے، قوتِ نفسانی یا قوتِ مقناطیسی جو کچھ آپ کہیں تسلیم ہے کہ اس قوت کو حاصل کرنے والے عامل دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکتے ہیں۔ لیکن ان کا خود اپنے ہی عمل سے متاثر ہونا یہ ناممکن الوقوع بات ہے کیا آپ نے کوئی ایسا عامل بھی دیکھا ہے کہ دوسروں پر اپنا اثر یا توجہ ڈالے مگر اس چیز پر تو کچھ اثر نہ ہو۔ الٹا عامل پر ہی اثر پڑنا شروع ہو جائے۔ کیا عامل اس لئے عمل کرتے ہیں کہ ان کے اپنے ہی اوسان خطا ہو جائیں۔ گویا حضرت موسیٰؑ کی اس قوتِ مقناطیسی سے لکڑی کا تو کچھ نہ بگڑا۔ الٹا انہیں ہی وہ اژدہا نظر آنے لگی پھر وہ اس سے دہشت زدہ بھی ہوئے کہ پیچھے ہٹنے لگے۔

(۲) آپ نوعِ انسانی میں توارثِ افکار کا اصول تسلیم کرتے ہیں لیکن کسبِ کمال یا فن کے سلسلہ میں یہ اصول قطعاً نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ موسیٰؑ کی قوتِ مقناطیسی میں اثر جو کچھ بھی تھا، خواہ وہ حقیقتاً" اژدہا بن گیا تھا، یا بقول آپ کے وہ لکڑی کی لکڑی رہا۔ لیکن آپ نے اسے اژدہا ہی سمجھ لیا۔ اور پھر وہ ڈر بھی گئے۔ یہ زندگی بھر کا مقناطیسی اثر یک لخت ہی ظہور پذیر ہو گیا۔ یہ مقناطیسی قوت ابتدائے پیدائش سے آپؑ میں موجود تھی یا وحی کے ساتھ ہوئی۔ اگر پہلے سے موجود تھی تو پہلے بھی کوئی چھوٹا موٹا واقعہ دریافت ہونا چاہیئے۔

یہ تو عقلی اعتراضات تھے۔ اب نقلی اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عصائے موسیٰ کے متعلق موسیٰؑ سے یوں فرماتے ہیں:

"فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی" (۲۰: ۲۰-۲۱)

"موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ ناگہاں سانپ بن کر دوڑنے لگا۔ خدا نے فرمایا کہ اسے پکڑ لو اور ڈرو مت، ہم اس کو اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔"

اگر لکڑی لکڑی ہی رہی تھی تو اس کو پہلی حالت میں پھر لانے کا کیا مطلب ہے؟ چاہیئے تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ فرمانے کہ ہم تمھاری مقناطیسی قوت کم کر دیں گے یا چھین لیں گے۔ تاکہ تمھیں یہ لکڑی کی لکڑی ہی نظر آئے۔ سیرت تو بقول سید صاحب، موسیٰؑ کی بدلنی چاہیئے تھی تا کہ عصا کو

سید صاحب اسی قوتِ نفسانی کے اثر سے یدِ بیضاء کا مسئلہ بھی حل فرما دیتے ہیں۔ یعنی وہ بھی بس دیکھنے والوں کو چٹّا دکھائی دیتا تھا کوئی معجزہ یا مافوق الفطرت بات نہ تھی۔ بعد میں آپ کو خیال آیا کہ:

> اُس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عصائے موسیٰؑ کا اژدھا بننا اور ہاتھ کا چٹا ہو جانا بھی اسی طرح قوتِ نفسانی کا اثر تھا۔ جس طرح سحرۃ فرعون کی رسیاں بھی سانپ دکھائی دیتی تھیں تو خدا نے عصائے موسیٰؑ اور یدِ بیضا کو "فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِن رَّبِّكَ" یعنی ان کو خدا کی طرف سے "برہان" کیوں فرمایا ہے۔ مگر برہان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عصائے موسیٰ کا اژدہا ہونا یا ہاتھ کا چٹا دکھائی دینا فرعون اور اس کے سرداروں پر بطورِ حجت الزامی کے تھا، وہ اس قسم کے امور کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے کہ جس شخص سے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں وہ کامل ہوتا ہے۔ اور اسی سبب سے انھوں نے کہا کہ اگر کوئی کرشمہ دکھایا جائے گا تو وہ دعویٰ کو سچا جانیں گے"۔ (ج ۳، ص ۲۲۵)

اب سید صاحب کھل کر سامنے آ گئے۔ ان کے خیال کے مطابق عصائے موسیٰؑ اور یدِ بیضا معجزات نہیں بلکہ کرشمے تھے۔ جو سحرۃ فرعون کے کرشموں سے بڑے تھے، اسی لئے خدا نے ان کو برہان کہا ہے تو اس کا دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ موسیٰؑ سحرۃ فرعون سے بڑے ساحر ہوئے (نعوذ باللہ من ذالک)، صرف درجہ کا فرق تھا۔ اور یہی فرعون کا گمان تھا "اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ" جس کی سید صاحب نے تصدیق فرما دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے اس قول کو "وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ" کہہ کر مردود قرار دیا ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ!

دریا کا پھٹنا یہ واقعہ بھی قرآن میں کئی جگہ بصراحت موجود ہے کہ "جب موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات نکلے اور فرعون ان کے تعاقب میں نکلا۔ تو حضرت موسیٰؑ نے بحکم الٰہی دریا پر عصا مارا وہ پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ درمیان میں راستہ خشک پیدا ہو گیا۔ دریا کے دونوں حصے بڑے پہاڑ کی مانند کھڑے ہو گئے موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نے تو دریا عبور کر لیا اور جب فرعون اور اس کے لشکری داخل ہوئے تو دریا جاری ہو گیا۔ جس کی وجہ سے فرعون اور اس کے ساتھی غرق ہو گئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب سید صاحب کے ارشادات سنیئے :

"کوئی دریا پھٹا اور نہ کوئی خلافِ عادت معجزہ ظہور میں آیا تھا۔ بلکہ اس دریا کی سمندر کی طرح عادت تھی کہ مدّ و جزر (چڑھنا اُترنا) آناً فاناً اس میں ہوا کرتا تھا۔ پس جب رات کو موسیٰؑ بنی اسرائیل سمیت گزرے تھے اس وقت خشک تھا اور جب فرعون گزرنے لگا تو اتفاقاً چڑھ گیا۔" (ج ۱، ص ۹۹)

اب دیکھئے مادہ پرست تو ساری کائنات "اتفاقاً" ہی پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر سید صاحب نے دریا کے پانی کو اتفاقاً چڑھا دیا تو کونسی آفت آگئی؟ لیکن یہ حیرانگی ضرور ہے کہ مدّ و جزر کے اوقات مقرر و متعین ہوتے ہیں۔ جو سب لوگوں کو معلوم ہوتے ہیں۔ فرعون اور اس کے لشکری بڑے جاہل تھے کہ ان کی قلمرو میں ایک دریا بہہ رہا ہے اور وہ اس کے مدّ و جزر کے اوقات سے بھی واقف نہ تھے۔ جس کا علم بعد میں سید صاحب کو ہوا۔

اللہ تعالیٰ تو اس دریا کو پھاڑنے اور موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دینے کا ایک احسانِ عظیم کے طور پر بیان فرماتے ہیں اور سید صاحب ہیں کہ وہ اسے کچھ اہمیت ہی نہیں بخشتے۔ پھر احسانِ عظیم آخر کس بات کا تھا؟

بارہ چشموں کا پھٹنا

اسی طرح موسیٰؑ کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کو پانی کی ضرورت تھی۔ موسیٰؑ نے پانی کے لئے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کہا کہ "اپنا عصا پتھر پر مارو۔ تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔" اس کی توجیہہ سید صاحب یوں فرماتے ہیں،

"حجر" کے معنی "پہاڑ" کے ہیں اور "ضرب" کے معنی "رفتن" کے۔ پس صاحب معنی یہ ہوئے کہ "اپنی لاٹھی کے سہارے سے پہاڑ پر چل"۔ اس پہاڑ کے پرے ایک مقام ہے۔ وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے۔ خدا نے فرمایا "فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا" یعنی اُس میں سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے" (ج ۱، ص ۱۱۳)

یعنی اگر حضرت موسیٰؑ لاٹھی کے سہارے نہ چلتے تو شاید وہاں یہ بارہ چشمے موجود نہ ہوتے یہ لاٹھی کے سہارے چلنے کی برکت تھی کہ وہاں بارہ چشمے موجود تھے اور یہ بھی شاید لاٹھی ہی کی برکت تھی کہ وہاں بارہ چشمے موجود تھے کیونکہ بنی اسرائیل کے قبیلے بھی بارہ ہی تھے۔

پہاڑ کے لئے عربی میں جو الفاظ قرآن میں مذکور ہیں مثل جبل، جبال، رَوَاسِیَ، طور، صخر وغیرہ وغیرہ علی الترتیب چھوٹے بڑے پہاڑوں پر بولے جاتے ہیں۔ مگر حجر کے معنی پتھر ہی ہیں نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرب کا صلہ "فی" ہو تو اس کے معنی چلنا ہوتے ہیں جیسے "ضرب فی الارض" کے معنی زمین پر چلنا یا سفر کرنا ہے اور جب ضرب کا صلہ "ب" ہو تو اس کے معنی چلنا نہیں بلکہ کسی چیز سے مارنا ہوتے ہیں گویا "اضرب بعصاک" کے معنی "لاٹھی سے مارنا" ہی ہوں گے "لاٹھی کے سہارے چلنا" محاورے کے لحاظ سے بھی غلط ہے۔

معجزاتِ عیسیٰؑ | عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و ممات دونوں بڑے عظیم معجزے ہیں۔ حیاتِ عیسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کا باپ ثابت کرنے میں تو سید صاحب اکیلے ہیں۔ مگر وفاتِ عیسیٰؑ میں مرزا غلام احمد قادیانی (م ۱۹۰۸ء) بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں یہ الگ بات ہے کہ مقاصد دونوں کے الگ الگ ہیں۔ مرزا صاحب کو تو مسیح موعود کی خالی کرسی درکار تھی۔ وہ جب تک ان کو فوت شدہ ثابت نہ کرتے یہ نہیں مل سکتی تھی۔ اور سید صاحب کا مقصد مسلمانوں کو نیچر پسند ثابت کرکے مغرب سے سرخروئی حاصل کرنا اور مسلمانوں کو اس خرقِ عادت واقعات کو قبول کرنے کے بدنما داغ سے بچانا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان دونوں حضرات کے بنیادی نظریات میں براہِ راست تصادم ہے۔ ایک صاحب پکے فطرت پرست ہیں تو دوسرے کی زندگی کا مدار ہی کرامات والہامات پر ہے۔ تاہم وفاتِ مسیحؑ کے مسئلہ پر دونوں کا اتحاد ہو جاتا ہے۔ دونوں حضرات تاویلات میں خوب ماہر ہیں۔ اور مرزا صاحب نے تو بذریعہ کشف حضرت عیسیٰؑ کی قبر بھی کشمیر میں دریافت کر لی ہے۔

بہر حال یہ دونوں مسائل اتنے طویل ہیں کہ ان کے تذکرے کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باقی معجزات کے متعلق سید صاحب کے ارشادات سے قارئین کو ضرور مستفید فرمائیں گے۔

قرآنِ مجید میں متعدد بار عیسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات کا ذکر آتا ہے کہ وہ مُردوں کو باذنِ اللہ زندہ کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو یہ بھی بتلا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا اور کیا کچھ گھر میں رکھا ہے۔ اور کوڑھیوں کے مرض کو دور کر دیتے تھے۔ پرندوں کی مٹی سے شکلیں بنا کر اس میں پھونک مارتے تو وہ زندہ پرندے بن جاتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔ معجزات کو تسلیم کرنے کی وجہ سے سید صاحب کو علمائے کرام سے یہی شکوہ بھی ہے کہ وہ کیوں یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح ہی معجزات کی آیات کے معنی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

> "علمائے اسلام کی عادت ہے کہ قرآنِ مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے ان آیتوں کے معنی بھی وہی بیان کئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ حضرت عیسیٰ اندھوں کو آنکھوں والا اور کوڑھیوں کو چنگا کرتے تھے اور مُردوں کو جِلا دیتے تھے" (ج ۲، ص ۲۴۴)

مثل مشہور ہے کہ پہلے کتے کو بدنام کرو پھر اُسے مار ڈالو۔ یہی تکنیک سید صاحب اختیار کرتے ہیں۔ خود تو جہاں ضرورت پیش آئے تو بائیبل کی روایات بلاتکلف پیش کر دیتے ہیں۔ مگر علمائے اسلام سے یہ گلہ ضرور ہے کہ قرآن مجید کے مفہوم کو عیسائیوں اور یہودیوں جیسا ہی کیوں سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ تو صاف ہے کہ قرآن مجید اللہ ہی کا کلام ہے اور تورات بھی اللہ کا کلام ہے، محرّف شدہ ہی سہی مگر سارا تو غلط نہیں۔ بہت سی باتیں آج بھی ان دونوں کلاموں کی مل جاتی ہیں۔ اس تبصرہ کے بعد آپ مُردوں کو زندہ کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

> انسان کی روحانی موت اس کا کافر ہونا ہے۔ حضرت عیسیٰ خدا کی وحدانیت تسلیم کرنے اور خدا کے احکام بتانے سے لوگوں کو اس موت سے زندہ کرتے تھے اور کفر کی موت کے پنجے سے نکال لیتے تھے جس کی نسبت خدا فرماتا ہے "اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِیْ"

زندہ باد! مردوں کو زندہ کرنے کا انکشاف جو سید صاحب نے فرمایا ہے تو یہ کام تو سب انبیاءؑ ہی کرتے تھے۔ اس میں بھلا حضرت عیسیٰؑ کے خصوصی ذکر کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت پیش آئی؟ پھر فرماتے ہیں کہ:

> "اندھے لنگڑے اور چوڑی ناک والے کو، یا اس شخص کو جس میں کوئی عضو زائد ہو اور ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوتے کو اور کبڑے اور ٹھنگنے کو اور آنکھ میں پھلی والے کو معبد میں جانے اور معمولی طور پر قربانیاں کرنے کی اجازت نہ تھی یہ سب ناپاک اور گنہگار سمجھے جاتے تھے۔ اور عبادت کے لائق یا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق متصور نہ ہوتے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے یہ تمام قیدیں توڑ دیں اور تمام لوگوں کو کوڑھی ہوں یا اندھے یا لنگڑے، چوڑی ناک کے ہوں یا پتلی ناک کے، کبڑے ہوں یا سیدھے، ٹھنگنے ہوں یا لمبے، پھلی والے ہوں یا جالے والے۔ سب کو خدا کی بادشاہی میں داخل ہونے کی منادی کی۔ کسی کو خدا کی رحمت سے محروم نہیں کیا۔ کسی کو عبادت کے اعلیٰ درجے سے نہیں روکا۔ بس یہی ان کا کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کرنا تھا یا ان کو ناپاکی سے بری کرنا تھا [illegible] انجیلوں سے اچھا کرنے کا ذکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اس سے یہی مراد ہے اور قرآن مجید میں جو یہ آتیں ہیں۔ ان کے بھی یہی معنے ہیں۔" (ایضاً ص ۲۴۶)

بالفاظِ دیگر معجزات کی صفت کا آپ نے خود ہی ثبوت بہم پہنچایا کہ انجیل اور قرآن ان سب باتوں کے بیان کرنے میں مشترک ہیں۔ اور ان کے متبعین بھی ان سے ایک ہی جیسے معنی و مفہوم مراد لیتے رہے ہیں۔ اب بھی اگر سید صاحب اپنے فہم کا قصور نہ سمجھیں تو کیا کہہ سکتے ہیں؟ ہمیں ان کے اس فہم کو غلط ثابت کرنے کی مزید ضرورت بھی نہیں۔

قرآن نے معجزہ یا شانِ نبوت کے لیے بالعموم آیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اب تاویل کی راہیں یوں کھلتی ہیں کہ آیت اور بھی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً آیت بمعنی:

(۱) احکامِ شریعت:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۲/۱۸۷)	یہ خدا کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جانا۔ اسی طرح خدا اپنے احکام لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ تاکہ وہ پرہیزگار بنیں۔

(۲) نشانِ قدرت یا دلیل:

وفی الارض اٰیٰت للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون (۵۱/۲۰-۲۱)	اور یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس میں بھی۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں۔

(۳) نشانِ نبوت یا معجزہ:

اقتربت الساعۃ وانشق القمر وان یروا اٰیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر۔ (۵۴/۱-۲)	قیامت قریب آپہنچی اور چاند پھٹ گیا۔ اور اگر کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے۔

اب دیکھیے کہ احکامِ شریعت کے ساتھ صرف مومنین کا تعلق ہوتا ہے، کفار کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آیاتِ قدرت جیسے زمین آسمان، چاند، سورج، تارے بھی کافر و مومن میں وجہ نزاع نہیں ہوتے۔ تقریباً سب (سوائے خالص دہریت پسندوں کے) نشانِ قدرت تسلیم کرتے ہیں۔ اگر کبھی اختلاف ہوا تو صرف نشانِ نبوت یا معجزہ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ایسے ہی نشانات پر کفار کا جھگڑا اور تکرار ہوتا ہے اور یہی کو کبھی تو ایسے معجزات کفار کے مطالبہ سے پیشتر ہی مل جاتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصائے موسیٰ کا سانپ بننا اور ید بیضا پیغمبری کے ساتھ مل گئے۔ اور کبھی کفار کے مطالبہ پر ملتے ہیں۔ جیسے حضرت صالحؑ کو اونٹنی کا معجزہ کفار کے مطالبہ پر دیا گیا۔ جو پہاڑ میں سے برآمد ہوئی۔ ارشادِ نبوی ہے:

وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا۔ $\frac{17}{59}$

اور ہم نے ثمود کی قوم کو اونٹنی کا کھلا نشان دیا تو انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم ایسے نشان صرف ڈرانے کے لیے بھیجا کرتے ہیں۔

اور کبھی ایسے معجزات کفار کے مطالبہ میں بھی انبیاء کو نہیں دیئے جاتے۔ چنانچہ کفارِ مکہ نے حضور اکرمؐ سے کئی بار ایسے حسی معجزات کا مطالبہ کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے یہی جواب ملتا رہا کہ کفار سے کہہ دیجئے کہ معجزات دکھلانا میرے بس کی بات نہیں۔ میں تو صرف ایک بندہ اور رسول ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ حضور اکرمؐ کو کوئی معجزہ عطا ہی نہیں کیا گیا۔ قرآن سے حضور اکرمؐ کے درج ذیل معجزات کا ثبوت ملتا ہے:

۱۔ انشقاقِ قمر:

جس آیت سے چاند کا پھٹنا ثابت ہوتا ہے۔ وہ اوپر درج کی جا چکی ہے۔ لیکن ہمارے یہ دوست کہتے ہیں کہ یہاں چاند کے پھٹنے سے مراد یہ نہیں کہ وہ فی الواقع پھٹ گیا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ قیامت کے نزدیک پھٹ جائے گا۔ پہلے آسمان بھی پھٹ جائے گا۔ اور دوسرے اجرام بھی زیر و زبر ہو جائیں گے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دلیل اس لیے غلط ہے کہ جہاں قیامت کو ان آیاتِ الٰہی کے پھٹنے اور زیر و زبر ہونے کا ذکر ہے۔ وہاں کفار کے سحر کہنے کا کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ ہی کہیں قرآن میں ان آیاتِ الٰہی کے ساتھ سحر کا ذکر آیا ہے۔ انشقاقِ قمر کے معاملہ میں کفار کا اسے سحر سے تعبیر کرنا یا اس پر کفار کی تکرار ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ ایک حسی معجزہ ہے جو وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

حضور اکرمؐ کے معجزات

۲۔ واقعہ اسراء:

قرآن کریم میں ہے:

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من ... پاک ہے وہ ذات جو ایک رات اپنے بندے کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ لنریہ من اٰیٰتنا ۔ ۱۷/۱

مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا کہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھلائیں ۔

مکہ سے مسجد اقصیٰ کے اس سفر کو بھی ہمارے یہ دوست روحانی سیر سے تعبیر کرتے ہیں ۔ جو مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں ۔

۱ ۔ سبحان کا لفظ حیران کن واقعات کے موقع پر بولا جاتا ہے ۔ اور روحانی سفر خواہ آسمانوں کا ہو ۔ سب کے تجربہ کی بات ہے ۔ لہٰذا اس سے کسی کو حیرانی نہیں ہوتی ۔

۲ ۔ عبد کا لفظ روح اور جسم کے مرکب پر بولا جاتا ہے ۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سفر جسمانی سفر تھا ۔

۳ ۔ اس واقعہ کے بعد کفار کی تکرار اس سفر کے جسمانی ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے ۔ اور یہ تکرار تاریخی شواہد سے ثابت ہے ۔ اگر یہ سفر روحانی ہوتا تو تکرار اور جھگڑے کی نوبت ہی کہاں آتی ؟

ان تمام باتوں کے باوجود سید صاحب فرماتے ہیں :

"دراصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے معراج کی بہت سی باتیں جو خواب میں دیکھی ہوں گی لوگوں سے بیان کی ہوں گی ۔ منجملہ ان کے بیت المقدس میں جانا اور اس کو دیکھنا بھی بیان فرمایا ہوگا ۔ قریش سوائے بیت المقدس کے اور کسی حال سے واقف نہیں تھے ۔ اس لیے انھوں نے امتحاناً آنحضرتؐ سے بیت المقدس کے حالات دریافت کیے ۔ چونکہ انبیاءؑ کے خواب صحیح اور سچے ہوتے ہیں ۔ آنحضرتؐ نے جو کچھ بیت المقدس کا حال خواب میں دیکھا تھا بیان کیا جس کو راویوں نے "فجعل اللہ لی بیت فرفعہ اللہ لی انظر الیہ" سے تعبیر کیا ہے ۔ پس اس مخاصمت سے جو قریش نے کی آنحضرتؐ کا بجسدہٖ اور بیداری کی حالت میں بیت المقدس جانا ثابت نہیں ہو سکتا ۔" (ج ۶ ۔ ص ۹۲) ۔

سو یہ ہے وہ آپ کی قوت استدلال ، جس پر بعد میں آنے والے قرآنی مفکرین کو آپ پر ناز ہے ۔ جو ہوگی اور ہوگا سے شروع ہوتی ہے ۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص یہ تہیہ کر لے کہ وہ فلاں بات تسلیم نہیں کرے گا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے بجبر تو منوا نہیں سکتی ۔ بلاشبہ آپ نے مندرجہ بالا دلائل کا تجزیہ بھی کیا ہے اور پھر بھی یہی نتیجہ نکالا ہے کہ یہ کوئی حسی معجزہ نہیں تھا ۔ مثلاً "سبحان" کا لفظ ، لفظ تعجب تو ہے مگر یہ اسریٰ سے متعلق نہیں ۔ بلکہ لنریہ من اٰیٰتنا سے متعلق ہے ۔ نیز کفار کی مخاصمت اس وجہ سے تھی کہ نبی خواہ خواب کی بات بیان کرتا یا بیداری کی ، ان کے لیے یکساں باعث نزاع تھی ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اور اس سفر کے روحانی ہونے کی تائید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں حضرت ابن عباسؓ یہ قول بھی پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اس سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۶۰ کو معراج سے متعلق کیا ہے وہ یوں ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔ ۶۰/۱۷

اور جو نمائش ہم نے تمھیں دکھلائی اس کو لوگوں کے لیے آزمائش بنایا۔ (ترجمہ فتح محمد جالندھری)

مگر جب یہی ابن عباسؓ آیت بالا کو معراج سے متعلق کہنے کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ رُؤْیَا الْعَیْنِ فِی الْیَقَظَۃِ (یعنی بیداری کی حالت میں آنکھوں دیکھی حقیقت) تھی۔ تو سید صاحب حضرت ابن عباسؓ کی یہ بات ماننے کو آمادہ نہیں ہوتے۔ نہ ہی اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ لغوی لحاظ سے "رؤیا" کا لفظ خواب میں کچھ دیکھنے یا بیداری کی حالت میں دیکھنے دونوں طور سے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

معراج اسراء سے متعلق بعد میں آنے والے قرآنی مفکر جناب پرویز صاحب نے ایک اور نکتہ بیان بیان فرمایا ہے۔ کہ "مسجد اقصیٰ" میں "اقصیٰ" کے معنی دُور کے ہیں یعنی دُور کی مسجد۔ گویا اس لیلۃ اسریٰ سے مراد شبِ ہجرت ہے اور مسجد اقصیٰ سے مراد مسجد نبوی۔ . [۱] اور لنریہ من اٰیٰتنا سے مراد وہ شان و شوکت ہے جو مدینہ میں اسلام کو عطا ہوئی۔ لیجیے کفار مکہ کے سوال و جواب کا سارا مسئلہ ہی طے ہوگیا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اللہ تعالیٰ تو ایک رات کی بات کرتا ہے۔ اور مدینہ کے سفر میں تین راتیں لگ گئیں۔ پھر مسجدِ اقصیٰ ایک مشہور و معروف مخصوص مسجد کا نام ہے جو آج تک معروف ہے۔ اور مسجد نبوی اسی وقت سے آج تک مسجدِ نبوی کے نام سے مشہور ہے۔ تو پھر پہلے مسجد اقصیٰ کا ترجمہ پیش کرنا پھر اسے دُور کی نسبت سے مسجدِ نبوی پر منطبق کرنا کسی قرآنی مفکر کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

۳- وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ

حضورِ اکرمؐ کے معجزات جو قرآن سے ثابت ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جنگِ بدر میں آپؐ نے ریت کی مٹھی کفار کی طرف پھینکی تو اس کے ایک ایک ذرہ نے کفار کو اندھا کر دیا اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ ریت کی مٹھی تو واقعی آپ نے پھینکی تھی لیکن اس کو کفار کی آنکھوں تک پہنچا کر انھیں اندھا بنانا میرا کام تھا۔ اس سے حضورؐ کا معجزہ اور خدا تعالیٰ کی قدرت دونوں باتیں قرآن سے ثابت ہوتی ہیں مگر آپ ان دو باتوں کو ہواؤں کے رُخ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہواؤں کے رُخ کی ہی وجہ سے وہ ریت کی مٹھی اور اس کے ذرات کفار کی آنکھوں میں جا گھسے تھے تو یہ واقعہ کسی دوسرے صحابی سے کیوں نہ ہوا؟ پھر کیا ہواؤں کا رُخ صرف جنگ بدر سے ہی مخصوص تھا کہ اس جنگ کے بعد کبھی ہواؤں کا رُخ ایسا کرشمہ نہ

[۱] مسطرے تا ۱۱ میں بعض الفاظ مسودہ [illegible] جا سکے جبکہ صاحبِ مضمون سے اس وقت رابطہ ممکن نہیں [illegible] حسبِ ضرورت [illegible] کر دی گئی ہے۔ ان شاء اللہ

© rasailojaraid.com

دکھلا سکا۔"

خوارق عادت امور و واقعات

کیا دُعار کا کچھ فائدہ ہوتا ہے؟

قرآن کریم کے ابتدار میں سورۂ فاتحہ میں مسلمانوں کو یہ دعار سکھلائی گئی ہے کہ

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱/۵) — الٰہی ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔

پھر بیشتر مقامات پر دعار کرنے اور اُس کے قبول ہونے کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً

وَنُوحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْکَرْبِ الْعَظِیْمِ (۲۱/۷۶) — اور پیشتر اس سے پیشتر نوحؑ نے ہمیں پکارا تو ہم نے ان کی دعار قبول فرمائی۔ اور ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بڑی گھبراہٹ سے بچالیا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ (۴۰/۶۰) — اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھ سے دُعار کرو میں تمہاری دعار قبول کروں گا۔

یہ بھی فرما دیا کہ

اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ (۲/۱۸۶) — جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعار قبول کرتا ہوں۔

غرض قرآنِ کریم ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں دُعار اور اُس کی قبولیت کا ذکر آیا ہے۔ کچھ مواقع تو ایسے ہیں جہاں یہ ذکر ہے کہ کسی پیغمبر یا مومن نے دُعار کی تو اللہ نے اُن کی دعار قبول فرما کر مطلب برآری کر دی اور دوسرے مواقع ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ترغیب دی ہے کہ وہ اللہ سے دعار کریں کیونکہ اللہ ہی دُعار قبول کرنے والا اور حاجت روائی کرنے والا ہے اور کر دیتا ہے۔

مگر ان سب آیتوں کے انکار میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

"دُعار جب دل سے کی جاتی ہے ہمیشہ مستجاب ہوتی ہے۔ مگر لوگ دعار کے مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب کے لیے ہم دُعار کرتے ہیں، دُعار کرنے سے وہ مطلب حاصل ہو جاتے گا۔ اور استجابت کے معنے اس کا مطلب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل ہو جانا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی ہے۔ حصولِ مطلب کے اسباب جو خدا نے مقرر کیے ہیں، وہ مطلب تو انہی اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہو جاتا ہے، مگر دعا نہ تو اس مطلب کے اسباب سے ہے اور نہ اس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے۔ بلکہ وہ اس قوت کو تحریک کرنے والی ہے جس سے اس رنج و مصیبت اور اضطراب کو جو مطلب حاصل نہ ہونے سے ہوتا ہے تسکین دینے والی ہے۔" (جلد اول ص ۱۸)

(باقی آئندہ انشاء اللہ)

وی پی

آرہا ہے!

اپنے نام آنے والا رسالہ چیک کر لیں، اگر آپ کے پتہ کے ساتھ سُرخ رنگ کا گول نشان موجود ہے یا لفافہ پر "آپ کا چندہ ختم ہے" کی مُہر لگی ہوئی ہے تو براہِ کرم پندرہ روز کے اندر اندر اپنا سالانہ زرِتعاون دفتر کے نام روانہ کر دیں، یا آئندہ رسالہ بذریعہ وی۔پی۔پی وصول کرنے کے لیے تیار رہیں۔

آئندہ خریداری جاری نہ رکھنے کی صورت میں دفتر کو فی الفور مطلع فرمائیں۔

(شکریہ)

مینجر

© rasailojaraid.com